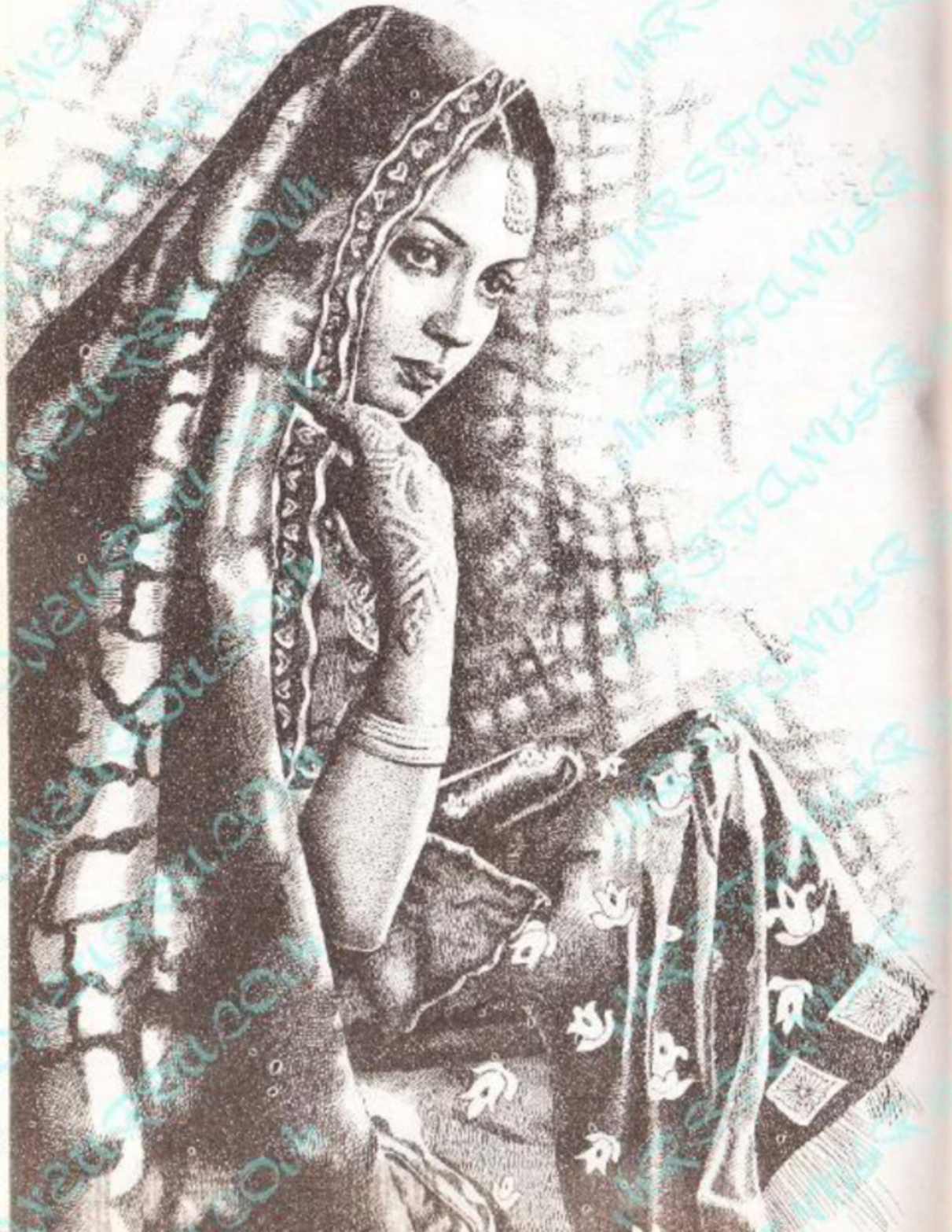

کالب بخاری

آنسو بھی مسکراتے ہیں

باہر کوئی گاڑی زور سے ہارن بجاتی گزری تھی۔ خضر بے اختیار ہی آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھا۔ بہت دیر سے چھائی خاموشی میں یہ مداخلت بڑی اجنبی سی محسوس ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر چلا آیا۔

چھوٹے سے کاریڈور میں سے گزرتا ہوا وہ برآمدے تک آیا۔ اماں تخت کے ایک کونے پر سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ اردگرد سے بالکل بے نیاز۔ سال ہونے کو آیا تب سے وہ اکثر ہی اس عالم میں رہا کرتی تھیں۔ اردگرد کے منظر سے بالکل لاتعلق۔ خضر نے کئی بار انہیں چپکے چپکے خود سے باتیں کرتے بھی سنا تھا۔

تقدیر کے ہاتھوں بھی ہولناک تنہائی کے ازالے کے طور پر وہ زیادہ وقت اپنی تخلیق کردہ دنیا میں بسر کرنے لگی تھیں۔

شروع شروع میں تو خضر بے حد گھبرایا تھا۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کی کوشش کیا کرتا۔ سب ہی کا مشورہ ہوتا تھا کہ اماں کے ساتھ ان کے پسندیدہ موضوعات پر بات کی جائے تاکہ وہ اس میں دلچسپی لیں مگر ایک آدھ بار میں ہی خضر کو اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا کہ یہ بے ضرر سا مرحلہ جان لیوا حد تک تکلیف دہ ہے۔

اس کے اور اماں کے بیچ محض لہو رنگ باتیں اور یادیں تھیں۔ زخم جن میں سے ابھی بھی لہو بہتا تھا' دور سے دیکھنے والوں کو شاید ان پر کھرنڈ آتا دکھتا ہو۔

مگر وہ اور کتنے ہی اس جیسے اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ گھاؤ اتنے ہی گہرے تھے جتنے آج سے سال بھر پہلے۔

اماں نے خاموشی میں عافیت ڈھونڈ لی تھی۔

"اور برا بھی کیا تھا' اذیت کے اس نہ ختم ہونے والے سلسلے سے وقتی طور پر کٹ کر کچھ لمحے ماضی کی خوشگواریت میں کھو کر بتائے جائیں۔"

وہ اس طرح دبے پاؤں برآمدے میں سے گزرا جیسے اماں کی عبادت میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔ صحن میں ایک چھوڑ دو ٹیوب لائٹس روشن تھیں جو کل ہی شام

ناولٹ

اس نے یہاں لگائی تھیں۔ پرسوں جب وہ شام کو یہاں پہنچا تھا تو برآمدے اور صحن میں جلتے ہوئے بلبوں کی روشنی سے خاصا وحشت زدہ ہوا تھا۔

"یہ کیسی عجیب سی روشنی ہو رہی ہے اماں! آپ نے ٹیوب لائٹس کیوں نہیں لگوائی ہیں یہاں۔"

اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تھا تو انہوں نے یوں چونک کر اس ٹمٹماتے بلب کی طرف دیکھا تھا' جیسے آج پہلی بار ہی دیکھ رہی ہوں۔

"پتا نہیں بیٹا! ہمیں تو خیال بھی نہیں آیا تمہیں اچھی نہیں لگ رہی تو بدل دینا صبح۔" حسب عادت وہ فوراً ہی متفق ہو گئیں۔

"ابا کہا کرتے تھے کہ۔۔۔"

مگر اب ابا بھی کہاں تھے؟

برآمدے سے صحن میں اترنے والی سیڑھیوں پر وہ بے اختیار ہی کھڑا رہ گیا۔

ابا کتنی زور سے بولتے' ہنستے اور ڈانٹتے تھے۔

جس وقت وہ گھر میں ہوتے' سارا گھر گونجا کرتا تھا۔

اس نے ذرا سا گردن موڑ کر برآمدے کے آخری سرے پر بنے ہوئے دو کمروں کی طرف دیکھا۔ دونوں ہی کمرے مقفل تھے۔

ابا کا سونے والا کمرہ اور ان کی اسٹڈی۔

خوبصورت دبیز قالینوں میں ڈھکے اور قیمتی نادر کتابوں کا خزانہ سمیٹے' جہاں نقشین لکڑی کا فرنیچر سجا ہوا تھا' ان کی مخصوص آرام کرسی اور کمرے میں بسی کشمیری چائے کی دل فریب مہک' خضر نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کوئی گزرا ہوا لمحہ دل میں اتارا۔

"کتنا بے وقوف ہوں میں وہ جو دو ٹیوب لائٹس کے بل پر منظر کا تبدیلی کی خواہاں ہوا تھا۔"

تب ہی اس نے آسیہ کو دیکھا۔

آسیہ!

زوار بھائی کی بیوی اور تایا ابو کی اکلوتی بیٹی جو اس سے اتنی چھوٹی تھی کہ وہ اماں کی بار بار ہدایت کے باوجود بھی زوار بھائی کی شادی کے آٹھ سال گزرنے کے بعد بھی اسے بھابھی نہیں کہہ پاتا تھا۔

اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ بچپن سے بدتمیزیوں پر جب وہ صفی کے ساتھ ساتھ آسیہ کے بھی جس بے تکلفی کے ساتھ تھپڑ لگاتا آیا ہے' اسے اب اس وجہ سے اتنا عزت' اتنا مرتبہ دیا جائے کہ وہ خوش قسمتی سے زوار بھائی جیسے شاندار شخص کی بیوی بن چکی ہے۔

مسکراتی آنکھوں اور دمکتی رنگت والے زوار بھائی جن کی شادی پر پیٹھ پیچھے خاندان بھر میں باقاعدہ "اظہارِ افسوس" کیا گیا تھا۔

"ایسی بھی کیا محبت بھائی کی' بھائی اکرام الٰہی نے تو حد ہی کر دی۔ ذرا جو جوڑ بنتا ہو' ایسے حسین جوان کے ساتھ اس جیسی ہی بجتی۔"

آسیہ بے چاری روپ رنگ میں تھوڑی سی مار کھائے ہوئے تھی۔

نہ کشمیریوں جیسی گلابی رنگت اور نہ ہی تیکھے نقوش۔ اس کی رنگت گندمی تھی اور نقش تھوڑے سے پھیلے پھیلے۔ آنکھیں البتہ بے حد خوبصورت تھیں۔ چہرے پر اپنی موجودگی کا احساس دلانے والی پھر بھی خاندان والوں کی تسلی نہ ہوتی تھی۔

آسیہ کی امی غیر برادری کی تھیں۔

تایا نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ آسیہ ہو بہو ان ہی کی شکل تھی۔ سو سارا قصور تایا ابو کی غیر دانش مندی کے سر جاتا۔

مگر وہی عام سی صورت شکل والی آسیہ زوار سمیت سارے گھر والوں کے سر پر چڑھی ہوئی نہیں' دلوں پر ایسی چڑھی تھی کہ ابا سے لے کر صفی تک کوئی بھی اس کی رائے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا اور وہ بھی سارا دن ایک پاؤں ادھر ایک پاؤں ادھر' کسی ایک جگہ ٹکتی ہی نہیں تھی۔ اوپر سے گھر میں ہر ایک کو مہمان نوازی کا روایتی چسکہ بھی تھا۔

ملنے جلنے والوں کا کوئی حساب کتاب ہی نہیں تھا۔

"خوشگوار ہنگامے میں ہمہ وقت ڈوبا یہ گھر' اب کیسا آسیب زدہ سا دکھائی دینے لگا ہے۔" خضر نے آسیہ کے جھکے ہوئے سر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

اور یہ آسیہ بھی اب کیسی فرصت کے ساتھ بیٹھی رائی پہاڑ جیسے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا اور واقعی رہا بھی کیا؟

سال ہونے کو آیا مگر یہ حقیقت ویسی ہی ٹھٹھرا دینے والی کیفیت پیدا کرتی تھی۔

خضر نے اسی سے گھبرا کر بے ساختہ ہی ذرا زور سے آسیہ کو پکارا۔

"آسیہ۔۔۔"

"ہاں۔" وہ فوراً ہی سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے خضر! کوئی کام ہے کیا؟"

"نہیں' بس ایسے ہی۔"

"کام تو واقعی کچھ بھی نہیں تھا مگر اس مہیب سناٹے کو توڑنے کے لیے کچھ نہ کچھ بات کرنا ضروری تھی۔"

"وہ چھوٹی کہاں ہے' بہت دیر سے نظر نہیں آ رہی ہے۔" اسے آسیہ کی سات ماہ کی بچی کا خیال آیا۔

"سو رہی ہے اندر۔ ابھی سو جاتی ہے اور پھر آدھی رات کو اٹھ کر پریشان کرتی ہے۔"

آسیہ کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری۔ پہلے یہ چمک اس کی آنکھوں کا لازمی حصہ بنی رہتی تھی مگر اب بس جب کبھی چھوٹی کے ساتھ لاڈ دلار کا کوئی مختصر سا وقفہ آتا تھا' تب ہی کسی کھوئی ہوئی یاد کی طرح۔

صرف سات ماہ کی چھوٹی' اتنی پاور فل تھی کہ آسیہ کو دوسری زندگی جینے کا حوصلہ کرنا پڑ رہا تھا' ورنہ بلو کے چلے جانے کے بعد۔

خضر کا دل بہت زور سے کانپا۔

ایک معصوم سی ہنسی بالکل کانوں کے قریب گونجی۔

"میں باہر جا رہا تھا آسیہ! کل کے لیے کچھ منگوانا تو نہیں ہے۔"

کن کن خیالوں سے بچ کر نکلتے ہوئے وہ اتنی ذمہ داری سے پوچھنے لگا۔ گویا یہی پوچھنے کے لیے یہاں کھڑا ہو۔

"نہیں' کچھ بھی نہیں۔ کیا منگوانا ہوگا۔" وہ ہلکے سے بولی۔

"پھر بھی' آخر گھر پر مہمان تو آئیں گے ہی نا۔" خضر کے لہجے میں اصرار تھا۔

آسیہ نے ایک نگاہ خضر کے چہرے پر ڈالی اور پھر ہلکا سا رخ موڑتے ہوئے بولی۔

"سارے مہمان ابا سے ہی پہلے آتے تھے خضر! اب وہ بھی نہیں رہے اور ان سے ملنے والے بھی نہیں۔ سب ایک ساتھ ہی۔۔۔"

اسے بولنے میں شاید دقت کا سامنا ہوا تھا۔ قریبی مسجد سے صبح عید کی نماز کا وقت بتایا جا رہا تھا۔

"اچھا پھر میں آتا ہوں' تھوڑی سی دیر میں۔"

کوشش کے باوجود بھی آسیہ کے ساتھ بات چیت اب چند مختصر سے جملوں سے آگے نہیں بڑھ پاتی تھی۔ گھر سے باہر وہ چلا تو آیا تھا مگر فوری طور پر کوئی بھی ایسا کام نہیں تھا جو سرانجام دیا جا سکتا ہو۔

گلی میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ گو پہلے جیسی چہل پہل تو نہیں تھی پھر بھی غنیمت تھی۔

"خضر خضر۔"

گلی کے کونے سے وہ مڑنے لگا تھا کہ کسی کے آواز دینے پر رکنا پڑا۔

جامی اپنے کمرے کے آگے بنی بالکونی میں کرسی بچھائے بیٹھا تھا۔

"اوپر آجاؤ' باتیں کریں گے بیٹھ کر۔"

حالانکہ پرسوں جب سے وہ آیا تھا' جامی کے پاس دو تین بار' اچھی خاصی دیر تک بیٹھ کر آچکا تھا مگر جامی جیسے دوستوں کے لیے وقت کی ناپ تول بے معنی تھی۔

لکڑی کا تنگ سا زینہ طے کر کے وہ اوپر چلا آیا۔

سامنے والے بڑے کمرے میں ٹی وی چل رہا تھا اور باورچی خانے سے کوئی بڑی ہی لذیذ سی مہک سارے میں اڑتی پھر رہی تھی۔

"السلام علیکم خضر بھائی!"

جامی کی چھوٹی بہن' استری شدہ کپڑوں کا ڈھیر لیے اس کے سامنے سے گزری۔

"وعلیکم السلام۔" وہ خوش دلی سے مسکرا دیا۔

چاند رات کو وہ رہ رہ کر صفی کی سرگرمیوں پر الجھتا مگر وہ اطمینان سے اپنا کام کیے جاتی اور ساتھ ساتھ میں اسے بھی جواب سے نوازے جاتی۔

"اصل میں تو ناخضر بھائی! آپ جیسے لوگوں کے اندر حسِ لطیف کی کمی ہے۔ ماحول کو خوبصورت بنانا بھی ایک آرٹ ہے اور آپ بے چارے۔۔۔"

"ارے چھوڑو' اصل بات صرف اتنی ہے کہ عید والے روز تمہاری ساری سسرال کو دھاوا بولنا ہوتا ہے ہمارے گھر پر۔ بس ان ہی کو متاثر کرنے کی ساری جدوجہد ہوتی ہے تمہاری۔ حالانکہ کچھ ہونا ہوانا نہیں ہے' شادی ہوجائے پھر دیکھنا۔ کیسے خبر لیا کریں گی تمہاری ساس نندوں کی بٹالین۔"

وہ مذاق اڑائے جاتا' صفی کا پارہ اوپر پہنچنے لگتا۔ اپنی سسرال اور ہارون کے متعلق برائی میں ایک لفظ بھی سننا اسے گوارا نہیں تھا' اور وہ لوگ تھے بھی اسی لائق۔

ہارون کی شفیق امی اور اس کی پیاری سی شرمیلی بہنیں جو اسے اور زوار بھائی کو دیکھ کر فوراً" سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی تھیں۔

وہ دو بہنیں بھی اسی کالج میں پڑھا کرتی تھیں' جہاں صفی پڑھا کرتی تھی' صفی سے ایک کلاس جونیئر۔

"خضر! یہاں اکیلا کیوں کھڑا ہے بیٹا! جامی اندر ادھر اپنے کمرے میں ہے۔" جامی کی امی نے کچن کی کھڑکی سے جھانک کر آواز لگائی اور پھر مسکرانے لگیں۔

زندگی سال بھر' اپنے لگے بندھے انداز میں گزرتی ہے' وہاں ابھی بھی سال پلک جھپکتے میں ہی گزرا ہے۔

دکھ کی گھڑیاں واقعی کاٹے نہیں کٹتیں۔ حالانکہ سارا سال کتنی زیادہ مصروفیت رہی۔ اسپتالوں کے چکر' گھروں کی مرمت' رشتہ داروں کی خبر گیری۔" خضر اٹھ کر بالکونی سے جھانکنے لگا۔

سامنے کی لائن میں تقریباً" سارے ہی گھر دوبارہ ٹھیک ٹھاک کیے جاچکے تھے پھر بھی کچھ دیواروں میں ابھی بھی بڑی بڑی دراڑیں دکھائی دیتی تھیں۔ یہ وہ حصے تھے جو گھر والوں نے کسی وجہ سے ابھی تک ایسے ہی چھوڑ رکھے تھے۔ "بہتری تو آئی ہے علاقے میں اور شکر ہے خدا کا کہ لوگ پُرعزم ہیں' ورنہ اتنے قیامت خیز زلزلے کے بعد سنبھلنے کے لیے سال کا عرصہ کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔"

وہ سامنے نگاہیں دوڑاتا ہوا کہنے لگا۔

جامی اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ خضر خاموش ہوا تو وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "تم بھی خالو کے دونوں کمروں کی مرمت کروالو۔ اگر چھٹی کا مسئلہ ہے تو بھی فکر مت کرو۔ میں ہوں' کرامت صاحب ہیں' منظور' فوقی اور بھی بہت لوگ ہیں۔ اپنی نگرانی میں کروالیں گے۔ دونوں کمرے تیار۔"

خضر واپس اس کے پاس پڑی کرسی پر آبیٹھا۔ اسے پتہ تھا کہ وہ بے حد خلوص کے ساتھ یہ سب کہہ رہا ہے اور باقی سب بھی اتنے ہی پُرخلوص ہیں جتنا کہ

بھلے' ہمیشہ اس بات کو سوچ کر تکلیف ہوتی رہے گی کہ میں 8 اکتوبر والے دن یہاں کیوں نہیں تھا۔ وہ ساری اذیت جو میرے خاندان نے اکیلے اٹھائی' میں اس میں حصہ دار کیوں نہیں بنا۔ میری جان ان لوگوں سے زیادہ قیمتی تو نہیں تھی جامی! اور پھر کیا پتہ میں ان میں سے کسی کو بچا بھی لیتا۔ دب کر فوراً" ہی تو نہیں مر جاتے ہیں۔ لوگ دم گھٹتے لمحوں میں انہوں نے کتنی دیر کسی مدد کا انتظار کیا ہوگا مگر کوئی بھی نہیں۔"

اس کا ایک ہاتھ بڑی بے قراری سے ہلا۔

"پھر وہی باتیں خضر! کتنی بار تمہیں سمجھایا ہے کہ یہ سب خدا کی طرف سے ایسے ہی پیش آنا تھا۔ مجھے تمہیں اور کتنوں کو ابھی اس قیامت کے بعد بھی زندہ رہنا تھا۔ سو ہم ہیں' جب ہمارا وقت آئے گا' ہم بھی چلے جائیں گے مگر ابھی ہم سے یقیناً کچھ کام لینے ہیں خدا کو۔ اس کی رضا پر راضی رہنا پڑتا ہے یار!"

جامی سے اس کی حالت پوشیدہ نہیں تھی۔ اسے پتہ تھا' وہ گھر میں اماں اور آسیہ کے سامنے خود کو کمزور نہیں پڑنے دیتا ہے۔ صرف اسی کے پاس بیٹھ کر اپنا دل ہلکا کرتا ہے۔ خضر کو نارمل ہونے میں چند منٹ لگ گئے۔

"اور تمہارے ٹرانسفر کا کیا ہوا' بینک والے کب تک بھیج رہے ہیں یہاں۔"

"بس عید کے فوراً" بعد ہی سمجھو' اسپیشل کیس کے طور پر کیا ہے میرا ٹرانسفر' ورنہ تو دور دور بھی کوئی چانس نہیں تھا پھر بھی یار! ہم لوگوں میں ہمدردی تو

گہری ہے، یہ بھی شکر ہے۔"

خضر کی پوسٹنگ لاہور میں تھی۔ مظفر آباد اس کا آنا جانا کم ہی ہوتا تھا مگر اب ایا اور زوار کے ایک دم ہی چلے جانے سے صورت حال یکسر تبدیل ہوئی تھی۔

اس ایک سال میں وہ زیادہ تر گھر پر ہی رہا تھا۔ بینک سے لمبی لمبی چھٹیاں لے کر۔

"مانتا ہوں لوگوں کی تباہی کے اس ہولناک وقت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور بساط سے بڑھ کر تباہ حالوں کی مدد بھی کی لیکن سچی بات ہے کہ زخم ہی بہت کاری ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ فاریہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا، یہاں ٹرانسفر کروانے پر۔"

دکھ اپنی جگہ مگر کیا ضروری تھا کہ چاند رات کے ان اولین لمحات میں صرف ان دکھوں ہی کی بات کی جاتی رہے جو اب زندگی کے آخری سانس تک دل سے بندھے تھے۔ جامی نے دانستہ فاریہ کا ذکر چھیڑا تھا۔ خضر جیسے کھل سا گیا۔

"کہاں یار! ایک قیامت مچادی ہے اس نے تو، کہتی ہے، مجھے نہیں رہنا لاہور سے باہر۔ اوپر سے اس کے گھر والے بھی اسے نہیں سمجھاتے۔ اکلوتی ہے نا تو لاڈلی بھی بہت ہے۔"

خضر کے لہجے میں فاریہ کے لیے بڑی رعایت تھی۔

جامی چند لمحے پُرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھے گیا پھر ہلکے سے بولا۔

"اس لاڈلی، اکلوتی کا گزارہ اماں اور آسیہ بھابھی کے ساتھ ہو جائے گا۔ یہ اچھی طرح سوچ لینا تم، خاص طور پر اب جبکہ حالات میں زمین آسمان کا فرق آچکا ہے۔"

جامی کی امی حلوہ اور کباب لے آئی تھیں۔ امی اور آسیہ بھابھی کا پوچھتی رہیں پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر واپس اندر چلی گئیں۔ خضر کا ذہن پھر سے جامی کے اٹھائے نکتے میں جا اٹکا۔

"بہت محبت کرتی ہے فاریہ مجھ سے، چھ سال سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ میرے حالات کے ساتھ بہت اچھا ایڈجسٹ کرے گی خود کو۔"

جامی ہلکے سے ہنس پڑا۔

"اچھی کمائی کرنے والے خوبصورت اور اکیلے لڑکوں کو بہت چاہنے والیاں مل جاتی ہیں۔ ابھی تک تو تمہارا وہیں سیٹل ہونے کا پروگرام تھا مگر اب ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔" خضر کو جامی کی بات ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ فاریہ اور وہ یقین کے جس بندھن میں خود کو محسوس کرتے تھے، اسے جامی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے شاید اتنے وسوسے بھری باتیں کر رہا تھا۔

خضر نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔

دکھ کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں فاریہ کے نام کی ہی ایک کرن باقی تھی، پر جامی جیسے بچپن کے دوست کی کسی بات کا بھی علی الاعلان برا نہیں مانا جا سکتا تھا۔

"کچھ بھی ہو یار! مگر اماں اور آسیہ بھابھی کو اب کوئی ذرا سی بھی تکلیف۔۔۔" جامی کی آواز بھاری ہونے لگی تھی۔ "بہت بڑا دکھ اٹھائے بیٹھی ہیں وہ لوگ پہلے ہی۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔" خضر اٹھ کھڑا ہوا۔

"چل، میں بھی چلتا ہوں۔ تھوڑی رونق دیکھ آئیں۔"

جامی نے پاس پڑی بیساکھی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

خضر نے دانستہ اپنا رخ باہر کی طرف موڑ لیا۔ جب بھی جامی کو بیساکھی کے ذریعے توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے دیکھتا تھا، اس کا دل جیسے کٹنے لگتا تھا۔

زندگی سے بھرپور، صحت مند۔

ابھی پچھلے سال تک ان کے سارے سرکل میں اس سے اچھا فٹ بال کا کوئی دوسرا کھلاڑی نہیں تھا۔ اسکول سے کالج تک ہمیشہ اسپورٹس کی بنیاد پر وہ نمایاں حیثیت رکھتا رہا تھا۔

آٹھ اکتوبر والے دن معمول کے مطابق اپنے آفس میں کام کر رہا تھا کہ اوپر سے گرے ملبے کے نیچے دب کر شدید زخمی ہوا۔ جان تو بچ گئی مگر ٹانگ پر آیا زخم

اتنا بڑھا کہ جان کو خطرہ لاحق ہونے لگا۔ مجبوراً ٹانگ کاٹنا پڑی۔

چار بہنوں کا اکلوتا بھائی گھر کا واحد کفیل۔ "معلوم نہیں زندگی کے بارے میں اب وہ کس طرح کے خواب دیکھتا ہے۔"

خضر نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

باہر صحن میں اس کی چاروں بہنیں جمع تھیں۔ اپنے لاڈلے بھائی کے قدموں پر سلامت۔

خضر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جامی کے گھرانے کو خوش قسمتی اور بدقسمتی کے درمیان کون سے خانے میں فٹ کرے۔

گھر میں موجود لوگوں کو اللہ کے فضل سے خراش تک نہیں آئی تھی۔ پرانی وضع کے گھر میں زیادہ تر لکڑی کا استعمال ہوا تھا۔ اتنا زیادہ نقصان دہ ثابت نہیں ہوا پھر ان کے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا بھی زیادہ رواج نہیں تھا۔ چاروں بہنیں میٹرک کے بعد گھر ہی بیٹھ رہی تھیں۔

"کاش ان کے ہاں بھی ایسا ہی کوئی رواج ہوتا۔" کتنی ہی بار خضر کے دل میں یہ خواہش ابھری تھی۔ صفی کا گریجویشن کا بس آخری سال تو تھا۔

صفی۔

ہارون کی بہنیں۔

پڑوس والے صادق بٹ صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی اور صفی کی کتنی ہی سہیلیاں۔

سب ہی معمول کے مطابق کالج گئی تھیں اور پھر من مٹی کے نیچے دفن ہو گئیں۔ ایک سرد سی لہر آج بھی اسے ریڑھ کی ہڈی میں سرسراتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

ہاں، صفی اور زوار بھائی کی شناخت کا مرحلہ اس کی زندگی کا سب سے جان گسل وقت تھا۔

"لوگ آہستہ آہستہ زندگی کی طرف پلٹتے تو ہیں یار! ابھی کوئی کم بات نہیں ہے اور ان شاء اللہ تم دیکھنا قدرت خود ہی اپنے دیے ہوئے زخموں کا مداوا کرے گی۔ صبر کا اجر دینے کا تو وعدہ اس رب کریم کا ہے۔ ہم سب ان شاء اللہ بہت اچھا وقت دیکھیں گے۔"

"آمین۔" خضر نے دل کی گہرائیوں کے ساتھ کہا۔

تنگ سی سیڑھیوں پر سے جامی بڑی مہارت سے اترا تھا۔ زندگی کے اس نئے قرینے کو بھی بالآخر اس نے سیکھ ہی لیا تھا۔

"عید کے بعد ہو سکے تو اماں اور آسیہ بھابھی کو بھی ساتھ لاہور لیتے جانا پھر تو تم آ ہی جاؤ گے یہاں۔ اچھا ہے ان لوگوں کو بھی تھوڑا سا چینج مل جائے گا۔ جب سے اب تک وہ لوگ یہیں ہیں۔" سڑک پر مڑتے ہوئے جامی کہنے لگا۔ بات بھی اچھی۔

خود خضر کو بھی کئی بار یہ خیال آیا تھا۔ اماں اور آسیہ دونوں کی عدت ختم ہونے کے بعد اسے امید تھی کہ فاریہ اور اس کے والدین بھی شاید انہیں اپنے گھر بلانے کا کہیں مگر ان لوگوں کو ایسا کچھ خیال آیا ہی نہیں اور اس نے خود ایک دو بار ان کے سامنے اس بات کو چھیڑا کہ وہ اماں اور آسیہ کو یہاں کچھ دن کے لیے بلانا چاہتا ہے تو بھی وہ سب ہی اسے منع کرنے لگے۔

"کیوں ان بے چاریوں کو پریشان کرتے ہو، وہاں کم از کم انہیں جاننے والوں سے تھوڑی سی قربت کا احساس تو ہوتا ہوگا۔ یہاں آکر تو وہ بھی جاتا رہے گا۔"

باری باری سب نے ہی کچھ ایسا ہی اظہار خیال کیا تھا۔

اور اب جامی پھر سے یہی بات دہرا رہا تھا۔

خضر نے دانستہ فاریہ وغیرہ کی مخالفت کا ذکر نہیں کیا۔

جامی بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتا۔

آسیہ نے کچھ بھی لانے کے لیے نہیں کہا تھا مگر پھر بھی اس نے کچھ نہ کچھ لے ہی لیا۔ سویاں، دودھ، نمک، آئس کریم اور پھر ایک چھوٹی سی دکان پر ذرا رک کر چھوٹی کے لیے خوبصورت چوڑیاں۔

پچھلی عید پر تو ان میں سے کسی بھی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ اعصاب مرجانے کی حد تک منجمد تھے۔ وقت سب سے بڑا استاد ہے۔

بڑی سے بڑی مصیبت کے بعد بھی جینے کا حوصلہ

دے جاتا ہے۔
صبح کی نماز پر ملنے کا وعدہ کر کے وہ جامی سے رخصت ہو کر گھر آیا تو آسیہ جاگ رہی تھی۔
"اتنی پیاری چوڑیاں۔" اس کے چہرے پر خوشی سی پھیلی۔ "اب تو تمہاری چوائس کافی اچھی ہو گئی ہے خضر! ورنہ پہلے تو اوٹ پٹانگ چوڑیاں لے کر آتے تھے کہ میں اور صفی۔۔۔"
کہتے کہتے وہ یک دم ہی چپ ہوئی اور پھر چوڑیاں اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ چوڑیوں کا بھی کوئی ایک جھگڑا تھا۔
خضر کو یاد آیا۔
اس کے کتنے ہی چکر چوڑی والے کی دکان تک ہو جاتے تھے مگر صفی اور آسیہ کی تسلی نہیں ہوتی تھی اور آخر کار جب وہ ہاتھ جوڑ دیتا تو احسان عظیم کرتے ہوئے خود بازار کا رخ کرتیں۔ یادیں' یادیں اور بس یادیں۔

☆ ☆ ☆

صبح جب وہ نماز کے لیے تیار ہو کر باہر آیا تو اماں اسی کی منتظر تھیں۔
اس کے سلام کے جواب میں ماتھا چوم کر اسے اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نماز میں ابھی تھوڑا ٹائم باقی تھا۔ آسیہ شیر خورمہ لے آئی تھی۔
خضر نے ایک نگاہ اماں کے بستے ہوئے چہرے اور آسیہ کی جھکی ہوئی پلکوں پر ڈالی۔
وہ دونوں محض اس کی وجہ سے خود کو نارمل پوز کر رہی تھیں۔ سو وہ بھی اتنا گیا گزرا نہیں تھا۔
دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے شیر خورمہ کھایا بھی اور تعریف بھی کی۔ اتنی کہ آخر کو آسیہ ہلکے سے مسکرا ہی دی۔
"کل رات تمہارا موبائل مستقل بجتا رہا خضر! تم گھر ہی چھوڑ گئے تھے۔"
اس نے کہا تو خضر کو یاد آیا کہ اس سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے۔
رات وہ فاریہ کو فون ہی نہیں کر پایا تھا۔ جامی کے ساتھ بازار سے لوٹتے ہوئے دیر ہوئی اور پھر دل پر پڑا بوجھ اتنا بھاری ہو رہا تھا کہ وہ سچ مچ ہی بھول گیا۔
اور کتنی عجیب سی بات ہے کہ وہ فاریہ کو فون کرنا بھول گیا تھا۔
خضر کو سچ مچ بہت حیرت ہوئی تھی۔
شیر خورمے کا پیالہ ختم کر کے وہ واپس کمرے میں آیا تو اس کے سیل پر ایک نہ دو اکٹھی سات کالز آئی ہوئی تھیں۔
اور ان ساری کالز کے جواب میں وہ ایک بار بھی اسے اٹینڈ نہیں کر سکا۔
خضر کو ٹھیک ٹھاک اندازہ ہونے لگا کہ اب تک وہ اس سے کتنی ناراض ہو چکی ہوگی۔
اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ یہ وقت فاریہ کے اٹھنے کا نہیں تھا' اس کے اپنے معمول تھے جن میں عید کا دن بھی تبدیلی نہیں لا سکتا تھا۔
نماز سے واپسی پر اسے فون کر کے منا لینے کا پکا ارادہ باندھ کر وہ کمرے سے واپس برآمدے میں چلا آیا۔
اماں ابھی تک وہیں بیٹھی تھیں۔
"اچھا اماں! میں چلتا ہوں۔"
اس کی آواز پر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اندر ہی اندر لرز اٹھیں۔
برآمدے کی بڑی ساری محراب کے نیچے وہ بالکل اکیلا کھڑا تھا۔
وہ یوں ہی ساکت سی نگاہوں سے اسے دیکھے گئیں تب ہی ایک چہرہ اور نمودار ہوا۔
پھر ایک اور!
محراب کے نیچے کی خالی جگہ آہستہ آہستہ بھرنے لگی۔ اکرام الٰہی' زوار اور بلال عرف بلو۔ وہ سارے مسکراتے چہرے خضر کے دائیں بائیں آ کر کھڑے ہو چکے تھے۔
ان کی آنکھوں کی روشنی بڑھنے لگی تھی۔
"کیا ہوا اماں! طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔" خضر

پریشان ہو کر آگے بڑھا تو وہ لرز اٹھیں۔
اس ایک اکیلا خضر!
محراب کے نیچے ساری جگہ خالی پڑی تھی۔
"میں تو کبھی نظر بھر کر دیکھتی بھی نہیں تھی پھر بھی ڈر لگ گیا۔" خضر کے سینے سے لگی وہ جیسے خود سے مخاطب تھیں۔ ان کا کمزور سا وجود ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔
خضر آہستہ آہستہ ان کا سر تھپکے گیا۔ تسلی کے سارے الفاظ اتنی بار دہرائے جا چکے تھے کہ اب برا لگنے لگے تھے۔
نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا' اماں کو خود ہی احساس ہوا تو وہ اس سے الگ ہو گئیں۔
"جاؤ' نماز کو دیر ہو رہی ہے۔"
"خدا حافظ۔"
وہ کہتا ہوا صحن سے گزرنے لگا تو کیاری کے پاس کھڑی آسیہ دکھائی دی۔
وہ رات کے ہی کپڑوں میں تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ گزشتہ ایک سال میں وہ بے حد کمزور گئی تھی۔ خضر کو کبھی کبھی اس کے صبر پر حیرت ہوتی تھی۔
اپنے پہاڑ جیسے غم کو اس نے اپنے اندر اتار لیا تھا کوئی واویلا' کوئی شکوہ' اس کے لبوں سے ادا نہیں ہوتا تھا۔
بس یوں ہی کوئی روز مرہ کی بات کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں جانے والے اس طرح آموجود ہوتے جیسے وہ کہیں نہیں گئے۔ یہیں موجود ہیں یا پھر زوار بھائی کے کپڑے چیزیں درست کرتے اور بلو کا بستہ کتابیں ٹھیک کر کے رکھتے ہوئے جو بے بسی' لاچاری سی اس کے چہرے پر پھیلی ہوتی' اسے دیکھ کر اس کے اندر کا دل اپنی جھلک دکھلا جاتا تھا۔
بیرونی دروازے کی طرف جاتے جاتے وہ آسیہ کے قریب آ کر رکا۔ پتہ نہیں کیا کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اب اسے خود اجنبی لگتے تھے۔
ایک پل کے لیے رک کر اس نے آسیہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔
نماز کے بعد لوگوں سے ملنے ملانے میں اچھی خاصی دیر ہو گئی۔
فارغ ہو کر وہ ابا' زوار بھائی' صفی اور بلال کی قبروں پر چلا آیا۔
یہاں وہ روز ہی آیا کرتا تھا' جتنے دن بھی رہتا اور ہر بار اس بات پر شکر کرتا کہ وہ کم از کم ان لوگوں کا یہ آخری کام ہی شاید کچھ بہتر طور پر کر پایا۔
ورنہ کتنوں کے پاس تو اپنے پیاروں کی یہ آخری نشانیاں بھی نہیں تھیں۔
بہت دیر وہ وہیں ایک پتھر پر بیٹھا رہا۔ جامی بھی اس کے ساتھ تھا کافی دیر تک رہا پھر وہ چلا گیا' تب بھی خضر کا دل ہی نہیں چاہا کہ یہاں سے اٹھے۔
گھر کے آدھے سے زیادہ مکینوں نے یہاں اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا' تب ہی قربت کی ایک آنچ تھی جو بہت نزدیک اٹھتی محسوس ہوتی تھی۔ "گھر پر اماں کو اب صرف اسی کا انتظار ہے۔" اگر یہ خیال نہ ہوتا تو شاید وہ وہیں بیٹھے بیٹھے شام کر دیتا۔
اب اٹھنا ہی پڑا۔
قدم بڑھاتے ہوئے اس کی الوداعی نگاہ' تھوڑے فاصلے پر دکھائی دی صفی کی آخری آرام گاہ پر پڑی تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ کوئی سر جھکائے بڑے خشوع و خضوع سے فاتحہ پڑھ رہا تھا۔
یہ ہارون تھا۔
گو اس کی خضر کی طرف پشت تھی پھر بھی اس نے با آسانی پہچان لیا تھا۔
وہ چند منٹ منتظر رہا کہ ہارون فارغ ہو جائے تو آگے بڑھ کر اس سے مل لے مگر جب وہ فاتحہ سے فارغ ہو کر وہیں بیٹھ رہا تو خضر اپنا ارادہ ملتوی کر کے آگے بڑھ گیا۔
ہارون' صفی سے ملنے آیا تھا اور اس ملاقات میں کسی کی بھی مداخلت' بے ادبی کے زمرے میں آتی تھی۔
ان دونوں کی منگنی تین سال پہلے ہوئی تھی اور اگر یہ قیامت نہ آئی ہوتی تو اس عید پر ان کی شادی طے تھی۔
ہارون اس کا کزن بھی تھا اور بے حد اچھا دوست

اس
اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ صفی سے کتنی زیادہ محبت کرتا تھا اس کے اور صفی کے رشتے کی بنیاد ہی اس پسند و ناپسند کے سبب پڑی تھی۔ منگنی کے بعد صفی اس سے بداخت قسم کا پردہ کرنے لگی تھی مگر وہ پھر بھی گھر والوں سے ملنے کے بہانے گھنٹوں آکر ان کے ہاں بیٹھا رہا کرتا تھا۔

آج بھی صفی پردے میں ہی تھی مگر ہارون کو اس سے دل کی بات کہنے میں کوئی عار نہیں تھی۔

پلکوں پر ٹکے آنسو کو خضر نے انگلی کی پور سے جھٹکا۔

گھر میں مہمانوں کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

پچھلی عید تو جس افراتفری اور صدمے سے گنگ حالت میں گزری تھی سو تھی۔

اوسان بحال ہونے کے بعد یہ پہلی عید آئی تھی، خاندان بھر میں سب سے زیادہ جانی نقصان ان ہی کے گھرانے کا ہوا تھا۔ سو سب لوگوں کا یہاں آنا ایک لازمی سی بات تھی۔

اندر بڑے ہال میں اماں اور ابا کے رشتے کے بہن بھائی اور ان کی اولادیں موجود تھیں۔ چند وہ بزرگ چہرے جنہیں وہ اپنے بچپن سے دیکھتا چلا آیا تھا۔ رشتے میں ابا کے پھوپھا اور ماموں لگا کرتے تھے۔ ماشاء اللہ ابھی بھی بقید حیات تھے۔

"خدا کی بے نیازی دیکھو، ہم کب سے سارے کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھے ہیں کہ کب بلاوا آتا ہے مگر نہیں آتا اور ہمارے بچے جنہوں نے ابھی زندگی کو ٹھیک طور پر برتا بھی نہیں تھا۔ آن کی آن میں دامن چھڑا کر چلے گئے۔" ہال کے ایک کونے سے کسی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تو اماں کے ساتھ بیٹھی خالہ بتول اپنی آنکھیں دوپٹے سے خشک کرنے لگیں۔

"ہمارا کام ابھی باقی تھا بھائی صفدر علی! ہمیں یہ غم دیکھنا تھا اپنے جوان بچوں کا۔ ہمارے نصیب میں ان کے کاندھوں پر آخری سفر طے کرنا نہیں لکھا تھا۔"

خضر سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا سنے گیا۔

جب بھی وہ سب لوگ اکٹھے ہوتے اسی طرح کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ دانستہ کوئی موضوع چھیڑا جاتا تو بھی یہی بات گھوم پھر کر دہرائی جانے لگتی۔

جانے والوں کا غم یا ان کے ساتھ ماضی کو شیئر کرنے والی یادیں۔

اس عمر میں وہ سب بے بس اور کمزور لوگ کر ہی کیا سکتے ہیں۔

خضر کو ان سب ہی سے بے حد ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ خود وہ بھی ان سے الگ نہیں تھا مگر عمر اور حالات نے وقت کے گزرنے کے ساتھ ۔ بہرحال اس چاروں طرف چھائی تیرگی کو کم کرنا ضرور شروع کر دیا تھا۔

اس نے ایک نگاہ مہمانوں میں گھری بیٹھی اماں پر ڈالی۔

صبح کی نسبت اب وہ زیادہ بہتر محسوس ہو رہی تھیں۔ بہت سارے لوگوں کے ساتھ اپنا غم بانٹنے سے انہیں کچھ تو ہلکا پن محسوس ہوا ہی تھا۔

"اور یہ بھی کتنا غنیمت ہے کہ ہم لوگ فطری طور پر محبت اور اخلاص کے مضبوط بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ نہ صرف خاندان، پڑوس بلکہ ساری قوم ہی۔" اسے آٹھ اکتوبر کی تباہ کاری کے بعد مدد کے بے تابانہ اٹھتے کروڑوں ہاتھ اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں یاد آئیں۔

وہ جن سے خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا، جنہیں کبھی کشمیر کی جنت نظیر وادی کو دیکھنے کا شرف تک حاصل نہیں ہوا تھا۔ حیران ہراساں اس طرح تڑپ اٹھتے ۔ جیسے یہ سب ان ہی پر بیت چکا ہے۔ وہ ملبے تلے خون میں نہایا ہوا جسم بھی سب ہی کا تھا اور اسکول جا نہ پلٹ کر آنے والا بچہ بھی۔

ایک درد مشترک نے سب کو زنجیر کیا تھا۔ اس بڑوں سے سنا تھا کہ "خوشی بانٹنے سے بڑھتی ہے اور بانٹنے سے کم ہوتا جاتا ہے۔" یہاں تو غم بانٹنے کے کروڑوں لوگ آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں۔ سوا

کو تو کم ہونا ہی ہے۔"

خضر کے دل کو بڑا گہرا یقین ہونے لگا۔

ایک روایتی سی مہمانداری گھر میں ہلکی سی چہل پہل شروع کر چکی تھی۔

آسیہ شاید کچن میں تھی اور رشتہ کی چند بہنیں چائے کی ٹرے اٹھائے ادھر سے ادھر آجا رہی تھیں۔

وہ مطمئن سا ہو کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

فاریہ کو فون کرنا تھا، معلوم نہیں اب تک تو وہ کتنی ناراض ہو چکی ہوگی۔

یہی اندازے لگاتے ہوئے اس نے فون کیا تو وہ فوراً" ہی مل گئی۔

"بہت برے ہو خضر تم، وہاں جا کر تو تم میری خبر ہی نہیں لیتے ہو۔ کل سے کتنی بار تمہیں فون کیا ہے مگر تمہارا موبائل بجتا ہی رہتا ہے۔ ریسیو کیوں نہیں کرتے ہو آخر۔"

بے حد غصے میں وہ لگاتار بولے جا رہی تھی۔ خضر کیا کہتا۔

وہ موبائل جو لاہور کی مصروف زندگی میں مستقل استعمال میں رہتا تھا، یہاں جس دن سے آیا تھا۔ اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر بالکل ہی کسی فالتو چیز کی مانند پڑا تھا۔

"یہاں مصروفیت اور طرح کی ہے فاریہ لوگوں سے ملنا ملانا سب ہی آرہے ہیں۔ ہمارے گھرانے کا المیہ ہے بھی تو کتنا بڑا، ابا، زوار بھائی، صفی اور....!"

خود کو بے حد مضبوط ظاہر کرنے کے باوجود بھی، وہ ان میں سے جس کا بھی نام لیتا تھا۔ بہت سارے آنسو گلے میں اٹکنے لگتے تھے۔

"ہاں، وہ تو خیر ٹھیک ہے۔" فاریہ خلاف عادت فوراً" ہی مان بھی گئی۔ "مگر تمہیں تو خود کو سنبھال لینا چاہیے۔ اپنی آگے کی زندگی کے بارے میں سوچو۔ کچھ دکھ اپنی جگہ، مگر ہمیں اپنے فیوچر کی پلاننگ بھی تو کرنی ہی پڑے گی، ایک تو تم نے اپنا ٹرانسفر بھی واپس وہیں کرا لیا ہے۔ لوگ تو کوشش کرتے ہیں بڑے شہروں کی طرف آتے ہیں۔ سوچو تو ایسا کس طرح چلے گا۔"

وہ ایک اعلا تعلیم یافتہ، حقیقت پسند، سمجھ دار لڑکی تھی، اور خضر ہمیشہ ہی اس کی ہر بات سے متفق ہوتا آیا تھا۔ اب بھی تھا، مگر پچھلے ایک سال میں بہت سے الفاظ اس کے نزدیک اپنے معنی کھو چکے تھے۔

مستقبل، پلاننگ، بہتر۔

اس کو زورا بھائی یاد آنے لگتے، پُرجوش، پُرعزم بہترین کیریر کے لیے کی گئی ان کی شب و روز محنت، آگے اور آگے دیکھنے کے عادی، صفی، جو بڑی لگن اور محبت کے ساتھ اپنے نئے گھر کے لیے خواب بنتی۔ پچھلے سالوں میں اس کے لیے کتنی چاہتوں کے ساتھ جہیز کی ایک ایک چیز اکٹھی کی گئی تھی۔ وہ ساری چیزیں آج بھی اماں کے کمرے سے متصل اسٹور میں آج بھی رکھی تھیں۔ ان پر کوئی آنچ تک نہیں آئی تھی۔ خود صفی منوں مٹی تلے جا سوئی تھی اور ابا اور بلو۔

جس کے پاس کھلونوں کے نام پر صرف اور صرف ہوائی جہاز کے ماڈل جمع تھے۔

جو فضا میں اڑتے ہوئے جہاز کو اتنے والہانہ طور پر تکتا تھا کہ سب ہی کو حیرت ہوتی تھی۔

"میں تو بنوں گا ہی بس پائلٹ!" وہ بے حد یقین سے کہا کرتا تھا۔

محض چند سیکنڈ میں ہزاروں لاکھوں خواب بھاری پتھروں تلے کچلے گئے۔

پس ثابت ہوا کہ دانش مندی کے ہزار دعووں کے باوجود بھی، انسان کے اپنے بس میں کچھ بھی نہیں، اور وہ اتنا بے بس ہے کہ اسے خود بھی اندازہ نہیں۔

اور پھر بھی اللہ کی بنائی زمین پر اکڑ کر چلتا ہے اور اللہ کی طرف سے جو نعمتیں اس کے حصے میں آتی ہیں۔ انہیں اپنی عقل مندی اور پلاننگ کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

فاریہ کی باتوں کے جواب میں وہ مستقل ہی صرف ہوں ہاں ہاں کیے گیا تو وہ بھی بور ہو گئی۔

"تم تھک رہے ہو۔ سو جاؤ تھوڑی دیر کے لیے۔ میں شام میں پھر فون کروں گی۔ کیوں کہ تمہیں تو فرصت ملے گی ہی نہیں۔"

اس کا لہجہ تھوڑا سا طنزیہ ہونے لگا تھا۔ مگر خضر نے دھیان نہیں دیا۔

فون بند کر کے وہ باہر نکل آیا۔

بڑے ہال میں سے ابھی بھی باتوں کی آواز آرہی تھی۔ شاید کچھ اور لوگ بھی آچکے تھے۔ وہ برآمدے میں سے گزر کر بڑے ہال کی طرف جانے لگا تھا کہ دفعتاً "ہی زور سے چونکا۔

"صفی' ادھر دیکھو' یہ کیا ہے میرے ہاتھ میں' صفی' صفی۔۔۔!"

ایک کھلکھلاتی ہنسی کے ساتھ' کوئی مستقل ہی اس نام کی گردان کیے ہوئے تھا۔ بہت بے تابی کے ساتھ خضر نے چاروں طرف دیکھا۔

برآمدے کی محراب کے نیچے صاف چمکتے فرش پر بیٹھی ایک نوعمر سی بچی' ہاتھ میں خوش نما سی گیند اچھال اچھال کر کھے جارہی تھی۔

دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنی گود میں بیٹھی چھوٹی کو سنبھال رکھا تھا' زوار اور آسیہ کی بیٹی۔

جو اس قیامت خیز زلزلے کے پانچ ماہ بعد اس دنیا میں آئی تھی۔

"صفی کتنی پیاری ہے۔ ہنس کر دکھاؤ!"

وہ پیاری سی بچی' خضر کی موجودگی سے بے نیاز مسکرا مسکرا کر کھے جارہی تھی۔

دونوں ہی کے گلابی گال' کچھ اور بھی دمکتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔

خضر کھویا کھویا سا' شاید چند منٹ اور بھی یوں ہی دیکھتا رہتا۔ اگر بڑے ہال سے نکل کر آتی ہوئی آسیہ کی نگاہ اس پر نہیں پڑتی۔

"میں نے چھوٹی کا نام صفی رکھا ہے یہ نام گھر میں گونجتا ہے تو کتنا اچھا لگتا ہے نا خضر!"

خضر چونک کر اس کی طرف مڑا۔

آسیہ مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ میں کہیں زندگی بھی مسکرائی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

خضر کو بڑا اچھا لگا۔

چھوٹی کا نام بھی اور آسیہ کی مسکراہٹ بھی۔

"بہت اچھا نام ہے۔ چھوٹی کے لیے اس سے سوٹ ایبل نام دوسرا کوئی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔"

اس سامنے کھیلتی بچی کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم اندر چلے جاؤ۔ سالم بھائی آئے بیٹھے ہیں' دوبار تمہارا پوچھ چکے ہیں۔"

آسیہ کی اطلاع پر وہ فوراً "ہی کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

مثبت سوچ کی اثر پذیری' سارے منظر کو بدلنے کی طاقت رکھتی ہے۔

یہ ہلکی سی خوشگوار تبدیلی بھی غنیمت تھی' سالم بھائی سگے پھوپھی زاد تھے۔

خضر اور آسیہ دونوں ہی کے۔

پھوپھی کئی سال پہلے انتقال کر چکی تھیں' اور سالم بھائی مع فیملی اسلام آباد میں مقیم تھے۔ ہر سال عید بقر عید کرنے' بڑے اہتمام سے اپنے آبائی گھر آتے تھے اور سب رشتے داروں سے مل کر واپس چلے جاتے تھے۔

اس بار اکیلے ہی آئے تھے۔ محض ایک دن کے لیے۔

"تمہاری بھابھی پھر آئیں گی' کچھ دن ٹھہر کر' اصل میں وہاں بھی ملنا جلنا اتنا بڑھ گیا ہے کہ لوگوں کو شکایت ہونے لگی ہے۔ پھر ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔"

خضر کے پوچھنے پر وہ بڑے فخر سے بتا رہے تھے۔

اماں کے پاس بیٹھی خالہ بتول کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں ابھرنے لگیں۔

"یہ ملنا جلنا تو خیر زندگی بھر کی مصروفیت ہے۔ مگر اتنے بڑے سانحہ کے بعد تو تمہاری بیوی کا وہیں اسلام آباد میں بیٹھے رہنا مناسب نہیں تھا۔"

ضعیفی کے ساتھ جڑی ساری قباحتوں میں' سب سے پریشان کن "صاف گوئی" ثابت ہوتی ہے' خالہ بتول نے جب سے سالم بھائی کو اکیلے آتے دیکھا تھا' تپی ہوئی بیٹھی تھیں۔

سالم بھائی جیسا طرار شخص بھی بوکھلا کر صفائی دینے پر اتر آیا تھا۔

ان کی بیوی رمضان کے آغاز میں ہی' عید اسلام آباد میں کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔

"میرے اعصاب بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ اوپر سے دس تکلیفیں اور جمع کر لو۔ وہاں کا رونا پیٹنا مجھ سے برداشت نہیں ہو سکے گا۔ سچ مچ بیمار پڑ جاؤں گی۔"

انہوں نے اپنا کہا پورا کیا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے باہر سے آیا ایک رشتے دار لڑکا بڑے جذباتی سے انداز میں بتا رہا تھا کہ "کتنے ہی لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر' یہاں خیمہ بستیوں میں رہنے والوں کے ساتھ عید منانے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔"

"یہاں تو شکر ہے حالات پھر بھی سنبھل رہے ہیں۔ ادھر اوپر پہاڑوں میں۔ جہاں انتہائی دشوار راستے ہیں' لوگ وہاں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اور خضر بھائی' وہ کہتے کہتے اس کی طرف مڑا۔ "بعض رضاکار تو سال بھر سے کچھ علاقوں میں مقیم ہیں۔ نہ ان کے کام کو ہائی لائٹ کیا جاتا ہے۔ نہ ٹی وی پر کوئی انٹرویو اور انہیں اس کی قطعی پروا بھی نہیں ہے۔ بس خاموشی سے اپنا کام کیے جاتے ہیں۔"

ایک بڑا گہرا احساس فخر تھا اس لڑکے کے لہجے میں' جسے وہ سب کے ساتھ شیئر کرنا چاہ رہا تھا۔

ایک جھینپی سی مسکراہٹ کے ساتھ سالم بھائی بھی ہاں میں ہاں ملانے لگے اور پھر بڑی صفائی سے بات کا رخ دوسری طرف لے گئے۔

"یار خضر! تم نے کمرے اب تک ٹھیک نہیں کروائے۔ اب تک تو یہ کام کروا لینا چاہیے تھا تمہیں۔"

ان کا اشارہ ابا کے کمرے اور اسٹڈی کی طرف تھا۔

"بس سالم بھائی! ابھی تک تو ہمت ہی نہیں پڑی۔ اب یہاں مستقل آجاؤں تو اللہ کا نام لے کر یہ کام بھی کروا ہی لوں گا۔" وہ آہستہ سے بولا۔

آسیہ نے سموسوں کا ڈونگا اور چائے لا کر رکھی تھی۔

"لے لو بیٹا! اس وقت تمہاری کوئی خاطر تواضع بھی نہیں ہو سکی ہے۔" اماں صبر کی چادر اوڑھے اسی طرح شفقت سے پیش آرہی تھیں۔ جیسے ہمیشہ آتی تھیں۔

اتنے سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود بھی جو جان لیوا دکھ' ایک اٹل حقیقت کی طرح ان کی زندگیوں میں موجود ہوا تھا۔ اس کا احساس بار بار ماحول پر چبھتی ہوئی افسردگی طاری کرتا تھا۔

سالم بھائی نے گہری سانس لیتے ہوئے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔

سامنے بیٹھی ہوئی اماں' جن کے سارے ہی بال اس ایک سال میں سفید ہو گئے تھے۔

پھیکے رنگوں کا لباس' ہلکی سی بھی آرائش سے محروم آسیہ۔

خود کو پوری طرح مضبوط ظاہر کرنے والا خضر' جو باوجود کوشش کے اپنی آنکھوں میں جمی اداسی کی تہہ کو نہیں ہٹا سکا تھا اور ایک دل توڑتی سی کیفیت میں گھرا یہ گھر' انہیں یک بہ یک ہی گھبراہٹ ہونے لگی تو وہ بڑے بڑے گھونٹوں میں چائے ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے' اماں اور خضر نے کھانے پر روکنے کے لیے اصرار بھی کیا تو وہ بڑے سلیقے سے ٹال گئے۔

"چند اور دوستوں سے بھی ملنا ہے ممانی! ان کے ہاں بھی ایسے ہی حادثے ہوئے ہیں۔ کھانے کا کیا ہے' پھر ان شاء اللہ آتے ہی رہیں گے۔" انہیں اٹھنے کی جلدی تھی۔

"اچھا ہی کیا رضو نے جو نہیں آئی۔ اتنا اعصاب شکن ماحول برداشت کرنا اس بے چاری کے لیے کہاں ممکن ہے۔ بس اللہ کرم کرے ممانی کے گھرانے پر۔"

اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اس بات پر شکر کیا کہ وہ اور ان کا گھرانہ اس ساری آفت سے بچا رہا تھا۔

ادھر اماں بڑی عاجزی کے ساتھ کہہ رہی تھیں کہ "بڑی مہربانی ہے سالم کی' جو ہمارے غم کا احساس کر کے یہاں چلا آیا۔ اللہ اسے اجر دے۔ بیوی بھی اس کی بڑی نیک بخت ہے۔ بے چاری کیا کرے' اپنی ذمہ داریوں میں گھری ہوئی ہے۔"

باہر اب خاموشی تھی۔ لڑکیاں جاچکی تھیں یا پھر کسی کمرے میں تھیں۔

برآمدے کے تخت پر آسیہ بیٹھی تھی۔ ابھی ابھی اس نے بچی کو سلایا تھا۔

"سوگئی ہے۔" خضر نے پیار سے بچی کے گال کو چھوا۔ "ویسے اس کی شکل بھی ہو بہو صفی جیسی ہے۔"

آسیہ ہلکے سے مسکرادی۔

"اماں بھی یہی کہتی ہیں' پتہ ہے خضر! جب میں نے اس کا نام صفی کے نام پر رکھنے کا سوچا تو میں ڈر رہی تھی' کہیں اماں کے لیے یہ تکلیف دہ نہ ہو۔ مگر وہ تو اتنا خوش ہوئیں کہ میں نے اس سارے عرصے میں انہیں پہلی بار مسکراتے ہوئے دیکھا۔"

آسیہ بتانے لگی تو وہ وہیں درخت کے دوسرے کونے پر بیٹھ گیا۔

"اماں بتاتی ہیں کہ یہ عادتاً" بھی صفی کی طرح ہی ہے۔ وہ بھی اتنی ہی خوش مزاج تھی اس عمر میں' اور کبھی کبھی ایسی ہی ضد بھی پکڑ لیتی تھی جیسی یہ' اور تو اور کھانے میں بھی باتیں اسی کی طرح....."

بہت دنوں بعد آسیہ باتیں کرنے کے موڈ میں میں آرہی تھی۔

خضر نے ایک بار بھی نہیں ٹوکا۔

صفی جیسی پیاری' محبت کرنے والی بہن کا صرف ذکر ہی باقی رہ گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ باقی لوگ بھی شامل ہونے لگے۔ زوار بھائی ابا اور بلو۔

کئی بار آسیہ کی آواز بھی کانپی اور اسے اپنی آنکھیں

"ویسے وہ بھی تمہیں بہت پوچھتی ہے' تم اور اماں پروگرام بنالو تو کچھ دن کے لیے لاہور چلے چلتے ہیں۔"

ابتدائی جملہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ تھوڑا سا لڑکھڑایا مگر اگلی بات اس نے پورے خلوص کے ساتھ کہی تھی۔

"اماں سے کہاں ہوگا سفر ابھی اور سچی بات ہے میری بھی ہمت نہیں ہوتی۔ تھوڑے دن اور گزر جانے دو پھر چلے چلیں گے۔" وہ ملائمت سے کہنے لگی۔

خضر نے اثبات میں سرہلایا' ایک امید سی بندھنے لگی تھی کہ آسیہ وقت کے ساتھ ساتھ' زندگی کی طرف' اور بہتر انداز میں پلٹ ہی جائے گی۔

صحن میں شام کا سرمئی غبار پھیلنے لگا تھا۔ چائے کے بعد باقی بچے ہوئے رشتے دار بھی رخصت ہوگئے تو گھر میں ایک دم ہی سناٹا چھانے لگا۔ اماں کا اب عبادت کا وقت تھا اور آسیہ بھی بچی کو لے کر اپنے کمرے میں جاچکی تھی۔

وہ جامی کے گھر جانے کے لیے نکلنے ہی لگا تھا کہ فاریہ کے خیال سے موبائل اٹھانے اپنے کمرے میں چلایا۔

پھر دو کالز آئی رکھی تھیں۔

خضر بے اختیار مسکرادیا۔

وہاں لاہور میں بھی وہ سارا دن اسی طرح بار بار فون کیا کرتی تھی۔ وہاں خضر ہر وقت دستیاب رہتا تھا۔

یہاں آنے کے بعد صورت حال بدل جایا کرتی تھی تو اس کی جھنجلاہٹ بڑی فطری سی بات تھی۔

بالکل بھی تھا وہ اس کی زندگی میں اہم ترین تھی۔

"تمہیں کیا ہو جاتا ہے خضر مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے۔ تم اور بالکل دن وہاں رہتے رہو گے تو مجھے بالکل ہی بھول جاؤ گے۔"

وہ رو دینے کو ہو رہی تھی۔

محبت ویسے ہی وسوسوں میں گھری رہتی ہے' جو کسی طور پر ہارنا نہیں چاہتے وہ اور بھی قابلِ رحم ہونے لگتے ہیں۔

خضر بڑی نرمی سے اسے تسلی دینے لگا۔

"سچ سچ بتاؤ' آج دوپہر میں تم کیا کرتے رہے تھے؟"

وہ یوں ہی اکثر منٹ منٹ کا حساب کرنے بیٹھ جایا کرتی تھی۔ خضر کو اکثر ہی سوچ کر ہنسی آیا کرتی۔ کہ آئندہ زندگی میں اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

"آج سب رشتے دار آتے جاتے رہے۔ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا رہا۔ پھر آسیہ کے ساتھ باتیں شروع ہو گئیں تو وقت کا اندازہ ہی نہیں رہا۔"

"کیوں' آسیہ اتنی دلچسپ باتیں کرتی ہے کیا؟" فاریہ کے لہجے کی چبھن بڑی نمایاں تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو' فاریہ! اس بے چاری کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے' سوائے درد بھری یادوں کے' اور وہ بھی آج اس نے کتنے عرصے بعد شیئر کی ہیں۔ پتہ ہے اس نے چھوٹی کا نام۔۔۔!"

"مجھے کچھ نہیں سننا' بہرحال تمہیں اتنی غم گساری کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے صاف کہہ رہی ہوں۔" وہ اپنی اسی صاف گوئی سے کام لے رہی تھی جس پر اسے ناز تھا۔ "میں کوئی الزام نہیں لگا رہی ہوں خضر! آسیہ نے بہت برا دکھ اٹھایا ہے۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے' مگر اس سے میں تمہیں اس کی دل جوئی کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

خضر کو اس کی کسی بات پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے معاملے میں وہ اتنی ہی پوزیسو تھی' سارا دن اسے یہی فکر کھاتی رہتی تھی کہ خضر اپنے آفس کی اسمارٹ اور پیاری سی لڑکیوں میں ذرہ بھر بھی دلچسپی لے رہا ہے یا نہیں۔ اور پھر ذرا سی بات بھی اس کے ہاتھ آجاتی تو وہ ایک بڑا ہنگامہ کھڑا کر دینے میں دیر نہیں کرتی تھی۔ پر وہاں وہ ان باتوں کو فاریہ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت سمجھ کر دل میں نازاں ہوا کرتا تھا۔

یہاں اور وہاں کے حالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

خضر کو اس کی بات پر رنج سا ہونے لگا۔

"آسیہ کا دکھ کوئی الگ چیز نہیں ہے فاریہ! جو ہم اسے اس کے غم کے ساتھ تنہا چھوڑ دیں۔ اگر اس نے اپنے شوہر اور بیٹے کو کھویا ہے تو میں نے بھی اپنے سگے بھائی اور بھتیجے کو کھویا ہے۔"

باوجود کوشش کہ خضر کی آواز رندھنے لگی۔ دوسری طرف چند لمحوں کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی۔ شاید فاریہ کو بھی اپنی تنگ دلی کا احساس ہوا تھا۔

"سوری خضر! میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔" فاریہ کا لہجہ سپاٹ تھا' کم از کم یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے۔ واقعی دل سے کہہ رہی ہے۔ "مگر میں پھر بھی اتنا ضرور کہوں گی کہ تم لوگوں کو آسیہ کے لیے کچھ اور سوچنا چاہیے۔ اس کے سامنے طویل زندگی ہے' جو صرف غم مناتے ہوئے نہیں گزر سکتی۔ ابھی تو تمہیں میری بات بری لگ رہی ہے۔ چند سال میں جب تم اپنی خوش و خرم زندگی گزار رہے ہو گے تو آسیہ کے ساتھ بھی تمہاری ہمدردی کم ہوتے ہوئے ختم ہونے لگے گی۔ اس وقت وہ ہماری فیملی کے ساتھ کتنی مس فٹ لگا کرے گی۔"

جتنا ٹھہر ٹھہر کر اور سمجھانے والے انداز میں فاریہ نے اپنی بات کہی تھی۔ خضر قائل نہ سہی' تھوڑا سا کنفیوز ضرور ہوا تھا۔

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اس بار اس کا لہجہ کمزور تھا' "مگر ابھی کچھ وقت تو بہرحال چاہیے۔"

"اب اور کتنا وقت خضر! ہماری شادی سے پہلے تمہیں ان پرابلمز کو تو حل کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ خود ہمیں سیٹل ہونے میں پرابلم ہوں گے۔" اسے

طور پر نا دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ پر اعتماد ہوئی۔ دھیرے دھیرے سمجھائے گئی۔

"میری باتوں کا برا نہ ماننا خضر! مجھے اپنی اور تمہاری دونوں کی بہتری درکار ہے۔ اور خود غرض سمجھو یا کچھ اور تمہارے اور اپنے بیچ مجھے کوئی بھی برداشت نہیں ہے۔ یہ بات میں تمہیں ہمیشہ یاد دلاتی رہوں گی۔"

فون بند کرنے سے پہلے اس نے آخری بات یہی کہی تھی۔

باہر شام رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔

"اپنے اوپر چھائی اس جذباتیت کو وہ ختم تو خیر زندگی بھر نہیں کر سکے گا۔ مگر کم ضرور کر لینا چاہیے۔ چاہے صرف فاریہ کے لیے ہی سہی۔" خود اپنے آپ سے کمٹ منٹ کرتا ہوا۔ وہ جامی کی طرف جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود چلا آیا۔

اس کی بیساکھی کی ٹک ٹک ابھی تک اتنی اجنبی سی لگتی تھی۔ خضر اسے لیے سیدھا اپنے کمرے میں آیا تھا۔

صرف جامی ہی تھا۔ جس سے اچھی بری بات بلا کھٹکے شیئر کی جا سکتی تھی۔

"کیا مطلب!"

خضر کی بات سن کر وہ اتنی ہی زور سے چونکا۔

"کیا مطلب ہے تمہاری فاریہ کا۔ آسیہ بھابھی کو تم کس طرح علیحدہ کر سکتے ہو۔ وہ تمہاری بھابھی ہی نہیں سگی تایا زاد بھی ہے' اور پھر زوار بھائی کی بیٹی بھی ہے۔ وہ بچی تمہارے علاوہ اور کس کی ذمہ داری ہے۔"

جامی سخت خفا ہونے لگا۔

خضر شرمندہ سا ہو کر نگاہ چرا گیا۔

واقعی چھوٹی بھی تو تھی۔ چھوٹی صفی۔

وہ اسے کیوں بھول گیا تھا' شاید اس لیے کہ وہ اسے بہت زیادہ اپنے سے قریب کرتا نہیں تھا۔ سارا دن وہ ادھر کھیلتی دکھائی دیتی۔ مگر وہ صرف پیار سے اس کے گال کو چھو کر ہٹ جاتا۔ دل میں اندر کہیں ایک خوف بیٹھ چکا تھا' بلال اس کے بے حد قریب تھا۔

"میں ذمہ داری سے پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا جامی! آسیہ اور صفی کو میں زندگی بھر خود سے الگ نہیں کر سکتا۔ مگر کل کو آسیہ اور فاریہ کی آپس میں نہ بنی تو اس تلخی سے پہلے ہی کچھ ایسا انتظام کر لیا جائے کہ گھر میں ایک الگ پورشن آسیہ کے لیے۔۔۔!"

وہ ایک قابلِ عمل راہ جو نکالنا چاہ رہا تھا۔ جامی کو وہ بھی قبول نہیں تھا۔

"سب بے کار کی باتیں ہیں' اصل میں تمہیں وہی صحیح لگتا ہے' جو فاریہ کہتی ہے۔ مرد بنو' ابھی سے اپنی لگام اس کے ہاتھ میں تھما دو گے تو بس اللہ ہی حافظ ہے۔"

وہ بے حد ناراض ہو چکا تھا اماں نہ آ کر بیٹھتیں تو وہ شاید اور بھی کچھ کہتا' فی الوقت وہ اماں کی طرف متوجہ تھا۔ اور ان کی گود میں بیٹھی صفی کی طرف۔

اس نے بچی کو گود میں لینا چاہا' تو وہ بجائے اس کے پاس آنے کے خضر کے پاس جانے کے لیے ہاتھ بڑھانے لگے۔

"دیکھو تم سے کتنی محبت کرتی ہے۔" جامی نے اسے خضر کی گود میں سکون سے بیٹھا دیکھ کر نہ جانے کیا جتایا تھا۔ وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر بچی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"اماں بتا رہی تھیں کہ چھوٹی کا نام صفی رکھا گیا ہے۔ اور وہ کتنی زیادہ صفی سے مشابہ ہے۔"

ساری باتیں خضر کی سنی ہوئی تھیں اس کا دھیان باتوں کی طرف کم اور گود میں بیٹھی صفی کی طرف زیادہ تھا۔

پہلی بار اس نے جانا کہ اس کی معصوم مسکراہٹ میں زندگی کا کتنا خوبصورت رنگ جھلکتا ہے۔ اس کی سبز سی جھلملاہٹ دیتی آنکھیں' ایک نگاہ میں صفی کی یاد دلاتی ہیں اور جب وہ شرارت سے اس کے چہرے کو چھوتی ہے تو اس لمس میں زوار بھائی اور بلال کا وجود بھی دھڑکتا ہے۔

آسیہ چائے دے گئی تھی۔

جامی نے دو ایک بار' خضر کی عدم توجہی کو نوٹ بھی

کیا۔ پھر اسے بچی میں مصروف دیکھ کر بڑے اطمینان سے مسکرا دیا۔

جب تک وہ جانے کے لیے اٹھا، صفی، خضر کی گود میں ہی سو چکی تھی۔

اسے آسیہ کو دے کر، وہ دروازہ بند کر کے، اپنے کمرے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ اماں نے اسے آواز دے کر اپنے کمرے میں بلایا۔ خضر کو تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی۔ وہ جتنی دکھی تھیں، سو تھیں۔ مگر آج ان کے رویہ میں بدلاؤ ضرور تھا۔

سرِ شام سے ہی ان کی خاموشی طویل ہو جاتی تھی۔ مگر آج وہ دن میں رشتے داروں میں گھری رہنے کے بعد جا ہی کے پاس آ کر بھی بیٹھی تھیں۔ اور اب جب کہ ان کے سونے کا وقت تھا، تب بھی وہ اس سے کچھ اور باتیں کرنے کی خواہش مند تھیں۔

"ذرا پہلے دروازہ برابر کر دو۔"

خضر ان کے کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ وہ کہنے لگیں۔

خضر نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔

اس وقت وہ بے حد سنجیدہ ہو رہی تھیں اور خود فراموشی کا وہ عالم جس میں وہ اکثر ہی رہنے لگی تھیں۔ اس وقت اس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

"بہت ہی ضروری بات کرنا تھی تم سے۔ صبح تک کے لیے ٹالی نہیں جا سکتی تھی کل ہی جواب دینا ہے۔"

انہوں نے بات شروع ہی اس انداز سے کی تھی کہ وہ ہمہ تن گوش ہو بیٹھا۔

"سال ہو گیا ہے زوار کو گزرے ہوئے۔ اب کسی فیصلے پر پہنچنا ضروری ہو گیا ہے خاندان کے بزرگ آج یہی بات کرنے آئے تھے، ہمیں اب آسیہ کے بارے میں کوئی فیصلہ کر لینا ہے۔"

خضر کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔

ایک خدشہ اسے خاندان والوں کی طرف سے بار بار لاحق ہونے لگتا تھا جسے اپنا واہمہ سمجھ کر اس نے بارہا ٹالا تھا۔

"آسیہ بہت کم عمر ہے، غم کا جو پہاڑ اس پر ٹوٹا ہے۔ اس کے ازالے کے لیے ہمیں اپنا دل کڑا کرنا ہی پڑے گا بیٹا!" اماں کے لہجے میں بڑی استقامت تھی۔

وہ ان کا مطلب سمجھ چکا تھا۔

"مگر آپ کو پتا ہے کہ میں صرف فاریہ سے ہی شادی کروں گا، اور خود ابا مجھے اس کی اجازت دے چکے ہیں۔"

وہ انہیں یاد دلانے لگا تو وہ بڑی حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

"تمہیں کون منع کر رہا ہے، بات تو آسیہ کی ہو رہی ہے۔ آپا بتول، اس کا رشتہ چاہ رہی ہیں فاضل کے لیے، فاضل بچی کو بھی بخوشی اپنانے کے لیے تیار ہے۔"

خضر کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔

فاضل بھائی، خاور بتول کے بڑے بیٹے تھے۔ پڑھے لکھے شریف اور ذمہ دار، چند سال پہلے ان کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ ایک بیٹا چھوڑ کر۔

"یوں تو خاندان میں کوئی بھی بخوشی اپنی بیٹی دے ہی دے گا۔ مگر آپا بتول کا خیال ہے کہ آسیہ جیسی بے مثال لڑکی کا ملنا ناممکن ہے۔ پھر یہ کہ ہماری صفی بھی قریب ہی رہے گی۔ یہ اطمینان بھی ہے کہ وہ اپنوں میں ہی پل رہی ہے۔"

اس رشتے میں بہت سے اچھے امکانات نظر آ رہے تھے۔ جس پر اماں بات کیے جا رہی تھیں۔ خود خضر کو بھی لگ رہا تھا کہ فاریہ اور اس کی آئندہ زندگی کے لیے یہ نیا سیٹ اپ بہت اطمینان بخش ہو گا۔ پھر بھی اس نے کہنا ضروری سمجھا۔

"آپ آسیہ سے ضرور پوچھ لیجیے گا۔ اس کی مرضی بہت ضروری ہے اماں!"

"میری آسیہ بہت فرمانبردار ہے۔ اس کی طرف سے تو انکار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بس صفی دور چلی جائے گی۔"

"ایک بار پھر۔" بہت مشکل سے اس نے خود کو کہنے سے روکا۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ وہ اماں کو آرام کی تلقین کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو دیکھا۔

آسیہ کے کمرے کی لائٹ بند ہو چکی تھی۔

سب کچھ شاید اسی طرح ٹھیک ہو جاتا تھا۔ فاریہ آسیہ اور وہ خود۔

سب ہی بہتر طور پر سیٹل ہو سکتے تھے۔ مگر ایک گہرا اطمینان جو اس نے خود کو دلانا چاہا تھا۔ وہ اس کے کمرے کی چوکھٹ کے دوسری طرف ہی کہیں رہ گیا تھا۔

اپنی کیفیت پر حیران ہو کر اس نے بار بار اس مسئلے پر سوچا اور خود پہلے سے بڑھ کر بے سکون پایا۔

کتنی عجیب بات تھی، حالات اس کے فیور میں اور بہتر ہو جا رہے تھے اور پھر بھی دل میں ایک چبھن سی بڑھتی جا رہی تھی۔

رات معلوم نہیں کس وقت تھوڑی دیر کے لیے اس کی آنکھ لگی تھی اور علی الصبح وہ بہت دہل کر اٹھ بیٹھا۔

"آج تم بہت جلدی اٹھ گئے ہو خضر!"

صبح کا دھندلکا ابھی پھیلا ہوا تھا، جب خضر کو چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے آسیہ پوچھ رہی تھی۔

"ہاں...!" کسی گہرے خیال سے چونک کر اس نے آسیہ کو دیکھا۔

"رات بار بار صفی میرے خواب میں آتی رہی ہے آسیہ!" اس کے سوال کی طرف دھیان دیے بغیر خضر ہلکے سے بولا۔

آسیہ کے چہرے پر ایک سایہ سا اترا۔

"جانے والے کب ہمارے خوابوں میں ہی تو آ سکتے ہیں خضر!"

"وہ ملنے بھی تو نہیں آئی تھی آسیہ! ہر بار بس جانے کہاں، نظر سامنے آتا رہا۔ کبھی جیسے وہ دلہن بنی ہارون کے ساتھ۔ ہمارے اس بڑے دروازے کو پار کر رہی ہے اور کبھی کفن میں لپٹی ہوئی، میرا کاندھا دینے کی منتظر۔"

خضر کی آواز کانپ رہی تھی۔

آسیہ نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کیا اور نرمی سے بولی۔

"ہمت رکھتے ہیں خضر! دل بھاری مت کرو۔ میں آج ہی صفی کے نام کا کھانا پکواتی ہوں۔ تم مسجد میں بھی کہہ دینا۔"

خضر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کے چہرے پر وہی ملائمت اور صبر تھا۔ جسے دیکھتے رہنے کو بھی دل چاہتا تھا اور باادب نگاہ جھکا لینے پر مجبور کرتا تھا۔

خضر نے بھی نگاہ جھکا لی۔

تب ہی اندر سے صفی کے رونے کی آواز آنے لگی۔

"تم ذرا صفی کو دیکھنا۔ میں ابھی آئی۔"

معلوم نہیں چولہے پر کیا تھا جو وہ الٹے پاؤں دوڑی تھی۔

خضر اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف آ گیا۔ دروازہ پورا کھلا ہوا تھا اور صفی سامنے بیڈ پر بیٹھی تھی۔

خضر کو دیکھتے ہی اس نے روتے روتے دونوں ہاتھ پھیلائے، تو اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔

ایک بڑی انوکھی سی خوشی، اس چھوٹے سے وجود کے ساتھ وابستہ ہونے لگی تھی۔ جس کا تجربہ اسے کل رات بھی ہوا تھا اور اب اور بھی زیادہ، سائیڈ ٹیبل پر زوار بھائی کی تصویر اسے یک دم اور بھی زیادہ مسکراتی ہوئی محسوس ہونے لگی وہ صفی کو گود میں اٹھائے اٹھائے، اس تصویر کے قریب آیا۔

"صفی اب وقت سے پہلے اس گھر سے رخصت نہیں ہو گی زوار بھائی یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

اس کے مضبوط لہجے کے پیچھے، پورے یقین کے ساتھ کیا گیا، ایک فیصلہ تھا۔

جو اسے ابھی اماں کو سنانا تھا اور ایک آخری فون کر کے فاریہ کو بھی۔